گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے دو اہل قلم فکشن نگار: اکرام اللہ، محمد عاصم بٹ

وقاص نبیل

Abstract:

Ikramullah is a well-known Urdu fiction writer known for his unique style. One of his characteristics is his deep observation of daily life and its small details, which examples are rarely found in Urdu fiction. His writing feels alive and full of energy, whether he's depicting someone's destiny, exploring their personality, or telling stories of love. Be they urban scenarios or escalating violence, images of despair or instances of magical realism, or plain realism. He never hesitates to have the last word in his narrative, especially at crucial moments where others act reluctantly, he walks with great confidence and courage. Overall, Ikramullah's work leaves a strong impression on readers with its vivid portrayal of life's intricacies.

After Ikramullah, we will talk about Muhammad Asim Butt. Asim Butt is considered among the writers of modern thought. In his fiction, he has tried to see the existential problems of modern man in the background of urban life. Contemporary consciousness is evident in his art and his stories are a reflection of modern human problems. Most of his characters are forced to live in a fantasy world away from reality where they satisfy their unsatisfied desires. We can say that Asim Butt's stories deal with the problems faced by individuals in the modern era such as the helplessness of the individual, loneliness, his retreat at the hands of destiny, economic and social oppression, monotony of life, meaninglessness, fear, illusion and indolence. We can say that the fictions of Asim Butt have an existential impression on which the influence of the German writer Franz Kafka can be clearly seen.

انفرادی، اجتماعی اور حکومتی سطح پر تو ادب کے فروغ کے لیے بہت سی کوششیں کی جاتی ہیں مگر بعض اوقات ادارہ جاتی سطح پہ کسی شعوری یا غیر شعوری کوشش کے نتیجے میں بھی یہ پھلتا پھولتا ہے۔ جیسے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور گورنمنٹ کالج لاہور جیسے اداروں نے اردو زبان و ادب کی پرورش میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اگر گورنمنٹ کالج لاہور کی بات کی جائے تو اردو ادب کی ہر صنف میں اس ادارے سے وابستہ ادباءو شعراءنے اپنی خلاقی کالوہامنوایا ہے۔ بہت بڑے نقاد اور محقق کہ جنھوں نے ملکی و غیر ملکی ادب کی تفہیم کو آسان بنایا گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ رہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں ادب کی پرورش کسی حکومتی تجویز یا سیاسی مصلحت کے نتیجے میں نہیں ہوئی بلکہ ہر شخص نے اپنی دل چسپی اور اپنی ذات کے امکانات کو دریافت کرنے کی خاطر لکھا اور یوں یہاں ادب کی ہر صنف کی مضبوط روایت وجود میں آگئی۔

اردو افسانوی ادب میں ایم۔اسلم، خشونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، آغا بابر، مرزا محمد سعید دہلوی، غلام الثقلین نقوی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اکرام اللہ، مسعود اشعر، انور سجاد، انیس ناگی، اصغر ندیم سید، مرزا اطہر بیگ، فرخندہ لودھی، محمد عاصم بٹ اور ڈاکٹر صائمہ ارم شامل ہیں۔ اسی طرح شاعری اور نظم نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سید غلام بھیگ نیرنگ، ایم۔ اسلم، احمد شاہ پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفی تبسم، سید مصطفی حسین زیدی، ن۔م راشد، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، قیوم نظر، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد صفدر میر، مرزا محمد منور، ناصر کاظمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جیلانی کامران، داؤد رہبر، مشکور حسین یاد، شہزاد احمد، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، سرمد صہبائی، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر غلام جعفر بلوچ، ڈاکٹر طاہر تونسوی، اصغر ندیم سید، باصر سلطان کاظمی، ڈاکٹر شبیہہ الحسن، ڈاکٹر سعادت سعید اور ڈاکٹر سہیل احمد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ یوں ہر شعبہ ادب میں اس ادارے نے مربوط اور منظم روایت قائم کرلی ہے جو کہ اس ادارے کے لیے فخر کا باعث ہے۔ یہاں ہم گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے دو اہل قلم اکرام اللہ اور محمد عاصم بٹ کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔ ان دونوں لکھاریوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی یعنی یہ دونوں اصحاب فکشن کے فنی تقاضوں سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں دونوں کا غیر ملکی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

دونوں کے ہاں غیر ملکی ادب کے اور خاص طور سے فکشن کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عام افسانہ نگار جس چیز کو در خور اعتناء نہیں سمجھتے وہ چیز ان دونوں لکھاریوں کے مشاہدے کی سان پر رگڑ کھا کر نئی معنوی چمک دمک پیدا کرتی ہے۔

اکرام اللہ:

اکرام اللہ کا شمار اُردو فکشن کے ان لکھاریوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے کم لکھا مگر جتنا لکھا اس کی خاص وقعت اور اہمیت ہے۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ "جنگل" (۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا اور دوسرا افسانوی مجموعہ "بدلتے قالب" (۱۹۹۲ء) میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف "بارِ گرد" میں بھی تین افسانے شامل ہیں۔ اکرام اللہ فکری و فنی تقاضوں کو بہت عمدگی اور شعور کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی اِنفرادی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اور ان کے فن پر مجموعی طور پر رائے دیتے ہوئے محمد کاظم لکھتے ہیں:

> "اکرام اللہ کا اُسلوب افسانہ نگاری اس کا اپنا ہے اور الگ پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت روزمرہ زندگی اور اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا ایسا ذہانت بھرا مشاہدہ ہے جس کی مثالیں اُردو فکشن میں بہت شاذ ہیں۔ دوسرے احساس کی شدت (Intensity) ہے، جس کے باعث اس کی ہر کہانی اور ہر افسانہ زندگی کی حرارت اور توانائی سے دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ چاہے کسی انسان کا سراپا بیان کر رہا ہو یا اس کا مزاج و کردار، یا مرد و عورت کے درمیان پائی جانے والی ازلی کشش کی کہانی کہہ رہا ہو، وہ اپنے بیانیہ میں آخری بات کہنے سے کبھی نہیں جھکتا۔ کہانی کے نازک مرحلوں میں جہاں دوسرے کے قدم لڑکھاڑا جاتے ہیں وہ بڑے اعتماد اور ادائے بے فکری (Non Chalance) کے ساتھ گزر جاتا ہے۔"[۱]

اکرام اللہ ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے حقیقت پسند افسانے کے ساتھ ساتھ تجریدی اور علامتی افسانے بھی لکھے۔ حقیقت پسندی میں وہ سفاکیت کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور حقیقت پسندی کی ساری گھمبیرتا کو بیان کرتے ہیں۔ افسانوی مجموعے "جنگل" میں موجود ان کا افسانہ "اتم چند" اس حوالے سے اہم ہے اور یہ حقیقت پسندی میں سفاکیت کی حدوں تک پہنچا ہوا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا بنیادی موضوع شکست خوردگی اور جنسی گھٹن ہے۔ "اتم چند" اپنے ہم جماعتوں، محلّے کے لڑکوں اور گھر باہر والوں سے تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔ اس کے دوست اسے بدصورت چمگادڑ کہہ کر پکارتے ہیں اور اس کا باپ لالہ دونی چند بات بے بات اس کی

پٹائی کرتا ہے اور اسے غلیظ گالیاں نکالتا ہے جسے وہ اس کی تربیت کا نام دیتا ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد دونی چند اپنے بیٹے کو شہر لے جاتا ہے تاکہ اس کے رتبے میں بڑے دوست رائے صاحب اس کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری پہ رکھوا دیں۔ رائے صاحبا تم چند کو ڈی۔ سی کا کلرک بھرتی کروا دیتے ہیں اور اپنے گھر کے پاس ہی وہ اسے کرائے پہ کمرہ بھی لے دیتے ہیں۔ "اتم چند" نے رائے صاحب ہی کے گھر میں ان کی بیٹی شیلا کو دیکھا ہوتا ہے۔ اس دن کے بعد وہ مسلسل سوتے اور جاگتے شیلا کے بارے خواب دیکھتا ہے کہ وہ کسی روز خود اس کے کمرے میں آئے گی اور اس سے اظہارِ محبت کرے گی مگر اتم چند کا یہ خواب محض خواب ہی رہتا ہے شیلا کو نہ آنا تھا نہ وہ آئی۔ کبھی کبھار شیلا کی چھوٹی بہن منی اس کے کمرے میں تانک جھانک کرنے آجایا کرتی ہے۔ ایک روز وہ اس کے کمرے میں آتی ہے تو اتم چند کو وہ ایک ننھی شیلا ہی نظر آتی ہے وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے جس کی وجہ سے منی کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اتم چند اس کے بعد خودکشی کر لیتا ہے۔ اس سارے منظر نامے کو اکرام اللہ نے یوں بیان کیا ہے:

> "وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف جھپٹا اور چٹخنی لگا دی۔ جلدی سے پلٹ کے اس نے حیرت وخوف سے دم بخود منی کو بستر پر لٹا دیا اور لالہ جی کی جھڑکیوں سے لے کر شیلا کی بے رخی تک کی تمام زیادتیوں کا بدلہ اس سے چکانے لگا۔ منی کے منہ سے ایک چیخ نکلی جو اس نے پاس پڑا ہوا کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس کے دبا دی۔ منی ایک دو مرتبہ اس کے سنگین بازوں میں باز کے تیز پنجوں میں جکڑے ہوئے کبوتر کی طرح تڑپ کے ساکت ہو گئی۔ اتم کی سانس تیز سے تیز تر ہو گئی۔ وہ اس وقت ایک مشین کی طرح تھا جو جذبات و احساسات سے عاری اپنی دھن میں چلتی رہتی ہے۔ اُسے ہوش آیا تو وہ پسینے میں شرابور اور کمرے کے وسط میں کھڑا کانپ رہا تھا اور انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخی سے تمام کمرہ سرخ ہو رہا تھا۔
>
> تیسرے روز اتم کے کمرے کا دروازہ توڑ کر کھولا گیا تو منی کی خون میں لتھڑی لاش کے اوپر مردہ اتم گلے میں بندھی رسی سے چھت سے اس طرح جھول رہا تھا جیسے کی بہت بڑے کلاک کا پنڈولم ہو۔"[۲]

یوں اتم چند اپنی بے بسی، احساسِ محرومی اور شکست خوردگی کا بدلہ منی کے ساتھ زنابالجبر کر کے لیتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے اتم کی بے بسی ہی ہے کہ وہ کم سن منی پہ ہاتھ ڈالتا ہے کیوں کہ شیلا سے بات کرنے

کے لیے اس کے پاس طاقت اور ہمت نہیں ہوتی تو یوں گویا یہ افسانہ انسانی شکست خوردگی کے ممکنہ ردِّ عمل کا افسانہ بن جاتا ہے۔

افسانہ ''محتاج'' انسانی خود غرضی کی کہانی ہے۔اس میں یہ بھی دکھایا گیاہے کہ اس دنیامیں زندہ رہنے کے لیے انسان کو کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔کہانی کے شروع میں دو پیدائشی اندھوں فتو اور بخشو کو دکھایا جاتا ہے جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں۔ایک دن ان میں نوراں میں آن شامل ہوتی ہے۔نوراں نے جوانی میں تین خاوند اور بہت سے گاہک بھگتائے ہیں مگر اب وہ اپنی ڈھلتی عمر سے پریشان ہے۔نہ وہ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے مانگنے سے کوئی بھیک دینے کو تیار ہے۔اسلیے وہ فتو اور بخشو کو قائل کرتی ہے کہ وہ ان کا کھانا پکا دیا کرے گی۔وہ کھانا پکانے کے علاوہ فتو کا بستر بھی گرم کرتی ہے کیونکہ فتو بخشو کے مقابلے میں کم عمر بھی ہے اور زور آور بھی۔ایک دن گاؤں سے ایک اور نابینا لڑکا احمد بھیک مانگنے شہر کی طرف آ نکلتا ہے۔احمد کو قدرت نے کوئل جیسی مدھر آواز سے نوازا ہے۔وہ سر لگا کر نعت پڑھتا ہے تو لوگ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے فتو اور بخشو کا دھندہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔نوراں احمد کو بھی اپنے گروپ میں شامل کر لیتی ہے اور ایک دن فتو اور بخشو کی تمام جمع پونجی لے کر احمد کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔بخشو اس وقت جاگ رہا ہوتا ہے مگر وہ سونے کی ایکٹنگ کرتا ہے اور اپنی ساری جمع پونجی جاتی دیکھ کر بھی اطمینان سے لیٹا رہتا ہے کہ چلو اسی بہانے فتو کی معشوق سے تو جان چھوٹی۔

افسانہ ''ایک دوپہر'' یکایک بدلتے انسانی رویوں پر لکھا گیا بہترین افسانہ ہے جس میں دکھایا جاتا ہے کہ احمد اور اس کے تین دوست (رحمت، حسینا اور ممدو) مل کر احمد کی محبوبہ زینو کو شادی کے منڈپ سے اٹھاتے ہیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتے ہیں۔زینو اپنے عاشق احمد کے ساتھ گھر سے بھاگ کر بہت خوش ہے اور اسے بتاتی ہے کہ اگر وہ اسے بھگا کر نہ لاتا تو وہ خودکشی کر لیتی مگر ہرگز کسی اور سے شادی نہ کرتی۔ادھر ممدو اور رحمت زینو کی خوبصورتی دیکھ کر احمد کو قتل کرنے کا پروگرام بناتے ہیں مگر اپنی طرف ڈھول اڑاتے آتے گھوڑوں کو دیکھ کر اپنا ارادہ بدل لیتے ہیں اور مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔یوں چاروں ساتھی زینو کی حفاظت کرتے ہوئے زینو کے باپ، بھائی اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔زنیو اپنے باپ کی قدموں میں گر جاتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ لوگ مجھے زبردستی اٹھالائے تھے۔

"قریب پہنچنے پر زینو کے بھائیوں نے کلہاڑیاں بلند کیں تو وہ روتے ہوئے باپ کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔ بابا یہ مجھے زبردستی اٹھالائے تھے میرا کوئی قصور نہیں۔ زینو جو فخر سے تنے سینے پر سر رکھ کر آئی تھی اپنے باپ کی جھکی کمر سے گال ٹکائے گھر واپس جارہی تھی۔"۳؎

اس افسانوی مجموعے میں "احتیاج" نامی ایک اور افسانہ بہت معروف ہے۔ اس افسانے میں دو مرکزی کردار نوجوان شرماں اور گانمن ہیں۔ دونوں نوعمر ہیں اور دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ایک ہی کھیت میں اپنی بھینسیں چرانے آتے ہیں۔ دونوں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی بہت لڑائی ہوتی ہے اور ضد میں آکر ایک دوسرے کی بھینسیں دور دور ہانک آتے ہیں۔ یہ تب ہوتا ہے جب ان کو جنسی شعور نہیں ہوتا۔ جنسی شعور آنے سے پہلے لڑائی کی صورت حال ملاحظہ کیجیے:

"اُلو کی پٹھی، حرام زادی، سُور کی بچی۔"

"تُو اُلو کا پٹھا، حرام زادہ، سُور کا بچہ۔"

"او، وہ بھینس گئی دریا میں تیرا باپ نکالے گا وہاں سے۔"۴؎

شرماں گانمن کی بھینسوں کو دریا کی طرف دھکیلنے کے لیے لٹھ لے کر ان کا پیچھا کرتی ہے تو ہانپتی دوڑتی شرماں کی جوانی گانمن پر آشکار ہو جاتہ ہے۔ اسی طرح شرماں بھی گانمن کو بغیر کپڑوں کے دیکھ لیتی ہے اور یوں جب دونوں کو جنسی شعور آتا ہے تو دونوں کا ایک دوسرے کے لیے رویہ بدل جاتا ہے۔ اور ان کی گفتگو میں اس طرح نرمی آجاتی ہے:

"تمھیں سردی لگ رہی ہے؟ اُس نے سر سے اوڑھنی اتار کے دی۔ لو اس سے جسم سکھالو" گانمن گیلے تہمد کا لانگڑ کسے بدن پونجھ رہا تھا۔ اُس کی ناف کے نیچے سے ایک لڑ اُس کی رانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیچھے چلا گیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود شرماں کی اچٹتی ہوئی نظر رانوں کے درمیان سنبھلے ہوئے بوجھ کو دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ ایک سنسناہٹ اُس کے سارے بدن میں دوڑ گئی اور نظر بھینسوں پر جا کے رک گئی۔ وہ چرے جارہی تھیں جیسے زندگی کا نام محض گھاس چرے جانا ہو۔"۵؎

اس افسانے کا موضوع جنس کا شعور بنتا ہے۔ دوسرے انسان کی جنس کا شعور دراصل اپنی جنس کے شعور کا ہی ایک پرتو ہوتا ہے۔ درج بالا دونوں افسانے جو موضوع بحث بنے ہیں یعنی "اتم چند "اور "احتیاج" ان کے موضوع کے بارے بتاتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"کتاب کے افسانوں پر نگاہ ڈالیں تو موضوعات کے لحاظ سے خاصہ تنوع نظر آتا ہے۔ مثلاً "اتم چند" کا موضوع جنسی گھٹن ہے تو "احتیاج" کا جنسی آگہی! اتم چند کے بہیمانہ اقدام کی توجیح کے لیے اس کی ابتدائی زندگی غربت اور سکول میں ہم جماعتوں کے ہاتھوں چغد بنتے رہنے کے تفصیلی تذکرہ سے ان نفسی عوامل کی نشان دہی کی ہے جن کی بنا پر وہ شدید احساسِ کم تری اور اس ڈرپوک "اتم چند" کا انتہا پسندانہ فعل اپنی تمام عریاں حقیقت کو لیے قاری کو پوری شدت سے اپنے وجود کو احساس کراتا ہے۔ "۶

"پل اور نقلی چوکیدار" اور "جنگل" دونوں علامتی افسانے ہیں۔ "پل" دنیا کی علامت ہے جہاں لوگ نفسانفسی کے عالم میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بانسوں پر نقلی چوکیدار لٹکا رکھے ہیں جن کے آٹھ آٹھ، دس دس سر ہیں۔ لوگ ان نقلی چوکیداروں سے خوف زدہ ہیں اور ان سے ڈر کر پل سے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔

"اکرام اللہ نے اس افسانے میں جس دنیا کی تصویر کشی کی ہے وہ نفسانفسی، خودغرضی اور لاتعلقی کی دنیا ہے۔ یہاں رشتوں کی تقدیس اور پیار کے بندھن بے معنی ہیں اسی لیے تو بیٹی کہتی ہے۔ "میرا کوئی رکھوالا نہیں ایک باپ تھا وہ بغیر کچھ پیچھے چھوڑے ادھر کو دگیا (بناوٹی سے روتی شکل بناتی ہے۔ اگر وہ کچھ بہت سامال چھوڑ جاتا تو کتنا مزا آتا۔ "۷

ہم کہہ سکتے ہیں کہ "پل اور نقلی چوکیدار" افسانے میں جو دنیا پیش کی گئی ہے وہ خودغرضی، نفسانفسی اور لاتعلقی کی دنیا ہے۔ اس پل کو پل صراط سے بھی تشبیہہ دی جاسکتی ہے جہاں ہر طرف نفسانفسی کا دور دورہ ہو گا، ہر طرف حشر بپا ہو گا اور ہر کوئی اپنی جان بچانے میں سرگرداں نظر آئے گا۔

افسانہ "جنگل" بھی ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مسافر کا جنگل میں راستہ ڈھونڈنا اور بار بار بھٹک جانا دراصل تلاشِ ذات کا سفر ہے۔ مسافر کو قوی امید ہے کہ وہ سیدھا راستہ تلاش کر لے گا مگر ایسا ممکن نہیں ہو پاتا اور وہ مصائب سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دیتا ہے۔

"راہ کا پتھر "عشقیہ داستان "ہیر رانجھا" کے سیکوئل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ رانجھا جوگی بن کر ہیر کو سیدو کھیڑے کے گھر سے بھگانے کے لیے آتا ہے مگر سیدا اس کی راہ میں دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور گڑگڑا کر ہیر سے اپنے پیار کی بھیک مانگتا ہے۔ رانجھا سیدے کی حالتِ زار اور اس کی ہیر کے لیے محبت دیکھ کر اپنے حق سے دستبردار ہونے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ سیدو کھیڑے کے کردار کو افسانہ میں اس

طرح پینٹ کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کا دل رانجھے کی بجائے ہیر کے خاوند سیدو کے لیے پسیج جاتا ہے اور اس کی ہمدردیوں کا حقدار بھی سیدو قرار پاتا ہے۔

افسانہ ''پکنک'' تین دوستوں کی کہانی ہے جو دریا پر مچھلی کا شکار کرنے جاتے ہیں۔ جب سارا دن ان کے ہاتھ کوئی مچھلی نہیں لگتی تو ایک دوست بندوق میں گولی بھر کر دریا کے پانی میں فائر کر دیتا ہے جو سیدھا جا کر ایک بڑی مچھلی کو لگتا ہے اور وہ پنی کی سطح پر تیر کر پانی کی روانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ ان میں سے ایک دوست اس مچھلی کو پکڑنے کے لیے دریا میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کرتا ہے مگر دریا کی موجوں کی تیز روانی دیکھ کر اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہے لیکن اسی لمحے اس کا دوسرا دوست اسے دھکا دے کر دریا میں پھینک دیتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے جزئیات نگاری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کہانی مزاح سے ہوتی ہوئی ایک ہولناک تاثر پر ختم ہوتی ہے۔ اس افسانے میں انسان کی ہوس، طمع اور لالچ کو دکھایا گیا ہے کہ کیسے اپنے ذرا سے ذاتی فائدے کے لیے لوگ کسی کی جان کو جوکھم میں ڈال دیتے ہیں، اپنے ایک پاؤ گوشت کے لیے دوسرے کی ساری گائے کٹوا دیتے ہیں اور پھر اپنی اس حرکت پر شرمندہ تک نہیں ہوتے۔ جعفر کے دوست اس بات پر افسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ چشمہ، ہیٹ، رومال، جوتا اور شکار کی گئی سون چڑی بھی پتلون کی جیب میں دبائے اپنے ساتھ لے گی اور ہو سکتا ہے کہ کار کی چابی بھی اسی کی جیب میں ہو۔

> ''یہ تو اب جعفر ہی بتا سکتا ہے اور وہ تو اب مچھلیوں کے درمیان ہو گا جو اس کے سینے پر لوٹ رہی ہوں گی، اس کے نتھنوں میں گھس رہی ہوں گی، اس کی مونچھوں سے کھیل رہی ہوں گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی مچھلی اسے کینچوا سمجھ کر ہڑپ کر گئی ہو۔ چلو آج دن کسی مچھلی نے کسی کیچوے کو کھایا تو سہی۔''۸

''سب راتوں جیسی رات'' اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ میاں بیوی اور ان کے بیٹا بیٹی گھر میں مورچہ سنبھالے بیٹھے ہیں اور دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس دوران ان کی بیٹی آ کر بتاتی ہے کہ نیچے کمرے میں دادی کا انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکی کی ماں اپنی ساس کو گالیاں نکالتے ہوئے کہتی ہے کہ بڑھیا سوانگ رچا رہی ہے یہ مرنے والی نہیں۔ اس کا شوہر نیچے جا کر اپنی ماں کے مرنے کی تصدیق کرتا ہے اور گھر کے صحن میں ماں کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودتا ہے لیکن اس دوران اس کی بیوی مسلسل اس بات پہ بضد ہے کہ بوڑھی کی لاش کو گلی میں پھینک دو صبح خود ہی کوے اور کتے اس کو نوچ کھائیں گے۔ جب اسکا شوہر ایسا کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی بیوی شوہر کو گولی مار کر ہلاک کر دیتی ہے۔ اتنے میں دشمن بندوق سے نکلی چنگاری دیکھ کر عورت پہ

حملہ کر دیتے ہیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔اس کے بچے صلح کا جھنڈا لہراتے ہیں مگر دشمن ان کو بھی گولیوں سے بھون دیتے ہیں۔

اس افسانے میں ایک تو یہ دکھایا گیا ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے وہ کبھی بھی دوسری عورت کی حکمرانی برداشت نہیں کر سکتی۔اور دوسرا یہ کہ جب آپ اپنے گھر کے شیروں کے دانت نکال دیتے ہیں تو گلی کے کتے بھی آپ کی چیر پھاڑ کرنے کے لیے کافی ہو جاتے ہیں۔مرد کے ہوتے ہوئے دشمن کی جرات نہیں پڑی کہ وہ اس کے گھر والوں کو کوئی گزند پہنچائے مگر اس کے مرتے ہی دشمنوں نے گھر کا کباڑا کر دیا۔

افسانہ ”ماتارانی“ ہندو میتھالوجی سے اخذ کیا گیا ہے۔گاؤں کے جوہڑ کے بیچ ماتارانی کی سمادھ ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا نظریہ ہے کہ ماتارانی اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو کر امر ہو گئی تھی اور جو بے اولاد عورت کسی شدھ برہمن کی زیرِ سرپرستی کسی اکلوتے بچے کو ماتارانی کے چرنوں میں ذبح کر کے اس کی لاش پر برہنہ کھڑے ہو کر نہائے اور اس دوران برہمن منتر پڑھے تو ماتارانی اس کام سے خوش ہو کر ایسی بے اولاد عورت کی جھولی ضرور بھرتی ہے۔

افسانہ ”ایک شاخِ نہالِ غم“ ایک مسلسل خود کلامی ہے جس میں واحد متکلم کردار کے ذریعے ہمیں صرف یہی پتا چل پاتا ہے کہ ایک مسلمان لڑکا ایک ہندو لڑکی سے پیار کرتا تھا اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان کو دو حصوں پاکستان اور انڈیا میں تقسیم کیا گیا۔ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے یہ دونوں عاشق (مدن اور نرملا) آپس میں مل نہیں پائے اور لڑکے کے دل میں یہ کسک آج تک باقی ہے جب کہ اس واقعے کو اب تیس سال گزر چکے ہیں۔یہ سارا افسانہ شاعرانہ انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں اکرام اللہ کی قوتِ تخیل کی بلند پروازی نکھر کر سامنے آتی ہے۔

افسانہ ”بدلتے قالب“ اکرام اللہ کے فن کی معراج سمجھا جاتا ہے۔اس افسانے کی کئی تخلیقی جہات ہیں علامتی حوالے سے بھی اور حقیقت پسند بیانیے کے حوالے سے بھی یہ افسانہ اپنی معنویت میں خاصا فعال نظر آتا ہے۔یہ افسانہ کافکائی اثر کے تحت لکھا گیا ہے ایک کریہہ شکل بوڑھی فقیرنی ایک غریب مگر خوبصورت لڑکی کو اُکساتی ہے کہ وہ اپنا جسم بیچ کر عیش کرے اور غربت کے جھنجھٹ سے نجات حاصل کر لے لیکن وہ نہیں مانتی آخر ایک دن وہ بس سٹاپ پہ جب کوئی آس پاس نہیں ہوتا تو اپنی روح اس لڑکی صفیہ کے جسم میں داخل کر دیتی

ہے اور اس کی روح اپنے بوڑھے اور نحیف و نزار جسم میں لے آتی ہے۔ اس افسانے کی علامتی سطح پہ تفہیم کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"اس علامت کے ذریعے افسانہ نگار نے نہ صرف مارشل لا کی چیرہ دستیوں کو بیان کیا ہے بلکہ عوام جس طرح ذہنی غلامی کے عادی ہوتے جا رہے تھے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔"۹

اس افسانے کی دوسری جہت عورت کا جسمانی استحصال ہے یعنی نسوانی موضوع کو بھی عمدہ اور فن کارانہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں:

"بڑھیا بے تاب ہو کر بولی او بیوقوف لڑکی سن! ہم عورتوں کا کوئی ذہن نہیں ہوتا، ہمارا فقط جسم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ذہنی بالیدگی وغیرہ کی بات بھول جا۔ پھر وہ جو تو بوڑھے جسم کو مردہ جسم کے برابر گردان رہی ہے، وہ بھی غلط ہے۔ اب تجھ سے کیا بحث کروں۔ جب تو اس بوڑھے جسم میں آئے گی تو تجھے خود بہ خود پتا چل جائے گا کہ بڑھاپا زندگی ہی کی ایک سٹیج ہے، جیسے بچپن اور جوانی۔"۱۰

محمد عاصم بٹ:

عاصم بٹ کا شمار جدید اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی وجہ شہرت بطور ناول نگار ہے۔ مگر ان کی کہانیاں بھی اُن کی پہچان ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں" اور "دستک" نمایاں ہیں۔ عاصم بٹ کے اہم افسانوں میں "آخری فیصلہ"، "گڑھے کھودنے والے"، "دستک" اور "اشتہار آدمی" وغیرہ نمایاں ہیں۔ عاصم بٹ کے افسانوں میں انسان کی اندورنی جذبات کا کرب اور شور سنائی دیتا ہے جس میں ذات کی تلاش اور معاشرتی پریشانیاں سرِفہرست ہیں۔ بعض اوقات انسان خود اپنے پیدا کی ہوئی مشکلات کی وجہ سے اپنے ہی ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار دیتا ہے۔ ان کے کردار زندگی کی پریشانی اور مصائب سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جدید معاشرتی ترقی کے نتیجے میں فرد کی تنہائی اور بے بسی عیاں ہے جہاں انسان کو اپنی پہچان کی تلاش ہے۔ معاشرے میں پننپنے والے یہ رویے ہماری جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انور احمد لکھتے ہیں:

''ان کے افسانے کے کردار نوجوان ہیں، مضطرب ہیں، وہ اپنی سماجی بے توقیری، جنسی افسردگی اور فتوحات کے لیے اضطراب کی خاطر صوفیا کے درباروں پر جاتے ہیں، جلسے جلوس میں جاتے ہیں، ہیرامنڈی جاتے ہیں، جہادی بنتے ہیں، کن ٹٹے بدمعاش بنتے ہیں۔ محبوب اور عاشق بدلتے ہیں مگر کچھ بھی نہیں بدلتا۔ نہ وہ اپنے بوڑھے والدین کی محرومیوں کو اپنے خوابوں میں آنے سے روک سکتے ہیں اور نہ نظام کی تبدیلی کے کوئی آثار ان کو نظر آتے ہیں۔''[۱۱]

عاصم بٹ کے افسانوی مجموعے ''اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں'' کی بات کی جائے تو ان کا افسانہ ''تیز بارش میں ہونے والا واقعہ'' طلسماتی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار حمید ناصر تیز بارش میں پناہ لینے کے لیے ایک گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں اسے ایک عورت خوش آمدید کہتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس عورت کو دمے کا دورہ پڑتا ہے اور وہ مر جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے وہ بتاتی ہے کہ اس کا بیٹا پی ایچ۔ڈی کر رہا ہے اور وہ اس کے لیے دوائی لینے گیا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے بیٹے کی بیوی اور بیٹی ایک فضائی حادثے میں مارے جا چکے ہیں۔ عورت کے مرنے کے بعد اوپری منزل سے کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ وہ اوپر جا کر دیکھتا ہے تو وہاں ایک کمرے میں ایک پچپن سال کے آدمی کو دیکھتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ میں ہی ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اور اب میں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ یہ بتا کر وہ آدمی مر جاتا ہے۔ حمید ناصر بیرونِ ملک کانفرنس میں چلا جاتا ہے اور پندرہ دن بعد دوبارہ جب واپس آتا ہے تو سیدھا اسی گھر جا پہنچتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک پچیس سالہ جوان اپنی بیوی اور بچی کو ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا ہے یہ وہی ڈاکٹر ریاض ہے جو پندرہ دن پہلے حمید ناصر سے ملا تھا۔ حمید سوچتا ہے کہ کاش وہ کسی طرح اس کی بیٹی کو سفر پر جانے سے روک لے مگر قسمت کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی۔

افسانہ ''شکاری'' کے مرکزی کردار کا مشغلہ خوبصورت تتلیوں اور مچھلیوں کو شکار کرنا ہے۔ اس کے گھر میں ہر طرف مرتبان رکھے ہوئے ہیں جن میں مری ہوئی تتلیاں اور مچھلیاں قید ہیں۔ وہ شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے حاصلات کی ہر طرف تعریف و توصیف کی جا رہی ہے اور طالب علم اس کی شخصیت پر مقالے لکھ رہے ہیں مگر جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے سر کو جھاڑیوں میں پھنسا ہوا پاتا ہے۔ آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جال لے کر ایسی تتلیوں اور مچھلیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے جو کبھی نہیں مرتیں اور ان کو پکڑنے والا بھی امر ہو جاتا ہے۔

رنگین تتلیاں اور مچھلیاں اصل میں وہ خواہشات ہیں جن کا پیچھا انسان ساری عمر کرتا رہتا ہے مگر وہ کبھی ہاتھ نہیں آتیں اور اگر ہاتھ آ بھی جاتی ہیں تو انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں ان کو انجوائے نہیں کرتا بلکہ امیدوں کا جال لے کر نئی خواہشات کی تکمیل میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

''عہدِ گزشتہ کی ایک کہانی'' ہمارے اجتماعی رویوں کا نوحہ ہے۔ ہم اپنے اردگرد بسے انسانوں کو اس وقت تک نظر انداز کرتے ہیں جب تک وہ گل سڑ کر ہمارے نتھنوں میں بو پیدا نہ کرنے لگیں۔

افسانہ ''خواب کہانی'' پاکستانی پنجابی فلم کے سپر سٹارز سلطان راہی اور مصطفی قریشی کے متعلق ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۷۵ء میں ہدایت کار حسن عسکری نے احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''گنڈاسا'' پر فلم بنانے کا اعلان کیا۔ یہ فلم ''وحشی جٹ'' کے نام سے ریلیز ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے باکس آفس پر چھا گئی۔ اس فلم کا سیکوئل ''مولا جٹ'' کے نام سے تیار کیا گیا۔ فلم ''مولا جٹ'' ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو پاکستانی سینما گھروں میں ریلیز کی گئی۔ یہ آج تک کی سب سے ہٹ پنجابی فلم ہے۔ اس فلم کی نمائش ڈھائی سال تک جاری رہی۔ مولا جٹ ایک علامتی کردار بن کر ابھرا جسے کئی دہائیاں گزرنے کے باوجود بھی لوگ فراموش نہیں کر پائے۔ یہ فلم ضیا الحق کے مارشل لا کے دور میں ریلیز ہوئی۔ فلم کا ولن نوری نت ضیا الحق کے کردار کے قریب ترین تھا جو تکبر اور رعونت سے بھرا ہوا تھا جبکہ مولا جٹ کا کردار حق اور انصاف کی خاطر لڑنے والے کا تھا۔ حکومت نے سینسر بورڈ کی مدد سے اس فلم پر پابندی لگوانے کی بہت کوشش کی مگر کسی طرح سرور بھٹی اس فیصلے کے خلاف عدالت سے سٹے آرڈر لینے میں کامیاب رہے۔ اس فلم نے سلطان راہی اور مصطفی قریشی کو شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیا اور پنجابی فلموں میں گنڈاسا کلچر کا آغاز ہوا۔ ۹ جنوری ۱۹۹۶ء کو سلطان راہی کو گوجرانوالہ میں قتل کر دیا گیا۔

افسانہ ''اشتہار آدمی'' کا مرکزی کردار زمان عورتوں کا رسیا ہے۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر ڈائری لکھتا ہے۔ وہ پراڈکٹ کا پبلسٹی ایڈ کرنے والی ماڈلز کا ڈیٹا اپنی ڈائری میں محفوظ کر کے رکھتا ہے۔ ماڈل گرل کی لمبائی، اس کے سینے کی چوڑائی، اس کی عمر اور حتکہ اس کی ادائیں بھی وہ ڈائری میں لکھ لیتا ہے۔ اپنی من چاہی عورت کا قرب جو اسے حقیقی زندگی میں میسر نہیں ہے وہ اسے خوابوں میں پا لیتا ہے۔ وہ چائے کے اشتہار میں ایک نئی ماڈل روبی کو دیکھتا ہے تو اسی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ وہ روبی کا ذکر اپنے دوستوں سے کرتا ہے تو وہ روبی کے متعلق بہت گھٹیا باتیں کرتے ہیں اور اس کا تعلق ہیرا منڈی سے جوڑ دیتے ہیں۔ زمان اپنے دوستوں سے ناراض ہو جاتا ہے اور ان سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زمان ہر وہ پراڈکٹ خرید تا ہے جس کے اشتہاری ایڈ میں روبی نے کام کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ

سب چیزیں روبی کو پہلی ملاقات میں بطور تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ اشتہاری کمپنی جہاں روبی کام کرتی ہے کے چکر لگا کر روبی کا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر جب وہ روبی کو فون کرتا ہے تو تب اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل پاتا اور دوسری طرف روبی ہیلو ہیلو بول کر فون رکھ دیتی ہے۔ اس دن زمان اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ آج روبی نے اس سے اظہارِ محبت کیا ہے۔

ایک دن ڈائجسٹ پر روبی کا انٹرویو پڑھتے ہوئے اسے پتا چلتا ہے کہ روبی کی ایک امیر زادے کے ساتھ منگنی ہو گئی ہے اور جلد وہ شادی کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سن کر زمان کو بخار چڑھ جاتا ہے اور وہ گھر میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہت دن بعد جب اس کی طبیعت سنبھلتی ہے تو وہ شبستان ریستوران پر جاتا ہے۔ دال چاول کھاتے ہوئے اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑتی ہے جس میں دو لڑکیاں ایک ہی گلاس میں دو سٹرا لگائے جوس پی رہی ہیں تو زمان کو لگتا ہے ان میں سے ایک لڑکی راحیلہ ہے جو اکثر اس کے خواب میں آتی ہے۔

> ”اس رات اس نے خواب میں اس لڑکی کو درختوں کے راہ الجھا دینے والے پیچیدہ اور تاریک کنج سے باہر نکال لیا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے اس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا“ میں نے راحیلہ کو کنج کی بھول بھلیوں سے نکال لیا جہاں وہ اپنی غلطی کی وجہ سے جا پھنسی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ بس روئے جاتی تھی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس طرح میرا شکریہ ادا کرے اور کیا کہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ پھر اس کنج کا رخ نہیں کرے گی۔ لیکن بالفرض اگر ایسی کوئی افتاد آ ہی پڑی تو اب کیا میں اسے اکیلے کہیں جانے دوں گا؟"۱۲؎

زمان کی نیچر کو ہم اس شعر سے واضح کر سکتے ہیں۔

عشق فطرت ہے میری دل دغا اور سہی
تو نہیں اور سہی وہ نہیں اور سہی

افسانہ ” آخری فیصلہ “میں اس المیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر چیز تبدیل ہو جاتی ہے لیکن اگر نہیں تبدیل نہیں ہوتا تو ہمارا دفتروں کا سسٹم اور نظام۔ عاصم بٹ کا افسانہ ”گڑھے کھودنے والے“ ذات کی تلاش کا اعلان نامہ ہے۔ اس ماحول میں انسان اپنے عارضوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ گڑھے کھود کر پھر اس کو بھرنا لا حاصل کا احساس دلاتا ہے۔ عاصم بٹ کے ہاں اندرون لاہور کے مناظر اور واقعات و کردار ملتے ہیں۔ افسانہ ” جنوں کی حکایت “خونچکاں میں مذہب اپنی حقیقی روح سے دور نظر آتا ہے ۔ انھوں نے اس افسانے میں لاہور کے ماحول اور کرداروں کی مدد سے مذہبی جنونیت کو پیش کیا ہے۔ عاصم بٹ کا فکری خمیر

روحانیت اور اولیاء اللہ کے سلسلوں کا کشیدہ کردہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کا عصری شعور پختہ ہے۔ وہ آج کے سماج کی جنسی بے راہ رویوں کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔

عاصم بٹ کے افسانوں میں اپنی ثقافت اور پنجابی زبان کا رچاؤ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کا انداز بیاں سادہ اور بیانیہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ فکری نظام کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیوں میں فضا بندی اور جزئیات و کردار نگاری کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کرداروں کی تشکیل بھی فنکارانہ دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر ارشد معراج کے مطابق:

> "محمد عاصم بٹ کے افسانوں میں جدیدیت کے عہد میں برتے گئے موضوعات کا عکس بھی ہے اور تازہ فکر بھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں علامت اور بیانیہ کا ایسا پیوند لگایا ہے جس سے اظہار کی معنویت کثیر جہتی ہو جاتی ہے۔"[۱۳]

عاصم بٹ کی کہانیوں میں جہاں سماج کی اچھائیاں بیان ہوتی ہیں وہاں برائیوں کو بھی بیباک انداز میں دکھایا گیا ہے۔ عاصم کی کہانیوں کی فکر ہمارے سماج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ وہ شہری دیہاتی زندگی میں روحانی اقدار اور جنسی مسائل کو بھی ایک ربط کے ساتھ کہانیوں میں برتتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں تخلیقی سطح کا احساس ملتا ہے۔ اُن کے لیے مختلف استعارے بھی بار بار ملتے ہیں جو ان کے فنی نظام کو ظاہر کرتے ہیں۔

عاصم کے افسانوں کے فکری و فنی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد حمید شاہد رقم طراز ہیں:

> "عام بٹ تخلیقی سطح پر تفکر سے دوچار ہوتے ہوئے بھی فکر اور نقطہ نظر کے نامیاتی وحدت میں ڈھل جانے سے شعوری سطح پر گریزاں رہا ہے تاہم اس کے ہاں اندرون شہر کی فضا ایک ایسا منظر نامہ بناتی ہے جس کے اندر سے قدیم معنی اپنے تناظر سمیت پھوٹ بہتے ہیں۔ پنجابی الفاظ اُس کے متن میں معاون ہوتے رہتے ہیں مگر اس نے زبان کو زیادہ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ علامت نگاری بھی اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ خواب، موت، بے چہرگی کے استعارے اُس نے برتے ضرور ہیں مگر انھیں نمایاں عصر نہیں بننے دیا۔ ایک فکری نظام کی تشکیل یا تشکیل شدہ کسی نظام سے وابستگی کی بجائے اُس کی کہانی کا مکمل انحصار جز و نگاری ، فضا بندی اور کرداروں کی تشکیل پر ہوتا ہے اور عاصم کے ہاں کہانی کے یہ وسیلے خوبی کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔"[۱۴]

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ عاصم بٹ فکری و فنی اعتبار سے ایک باصلاحیت، باشعور اور منفرد افسانہ نگار ہیں جو آنے والے وقت میں افسانے پر گہرا نقش قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عاصم بٹ کے افسانے اپنے عہد کا تجزیہ ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ انھوں نے سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کیا۔ یوں مجموعی طور پہ ہم دیکھتے ہیں کہ عاصم بٹ کے افسانوں میں فکری و فنی اور ہیئتی و تکنیکی حوالے سے بہت تنوع ملتا ہے اور ان کے اکثر افسانوں کی فضا مقامی اور غیر ملکی فضا کا تال میل ہے۔ انھوں نے بورخیس اور کافکا جیسے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوی تراجم بھی کیے ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانوں کی فضا اور اسلوب پہ ان افسانہ نگاروں کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد کاظم،فلیپ، مشمولہ:جنگل از اکرام اللہ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،1990ء

۲۔ اکرام اللہ، جنگل،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،1990ء، ص26

۳۔ ایضاً، ص۴۴

۴۔ ایضاً، ص45

۵۔ ایضاً

۶۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، دیباچہ، مشمولہ:جنگل از اکرام اللہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،1990ء، ص6

۷۔ ایضاً، ص۸

۸۔ اکرام اللہ،بدلتے قالب،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، 199۲ء، ص۱۵۶

۹۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،ملتان:کاروانِ ادب،2017ء، ص515

۱۰۔ اکرام اللہ،بدلتے قالب،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،1992ء، ص125

۱۱۔ انوار احمد،ڈاکٹر،اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ،ملتان:کاروانِ ادب،۲۰۱۷ء، ص۴۲۰

۱۲۔ محمد عاصم بٹ،اشتہار آدمی اور دوسرے افسانے، فکشن ہاؤس،لاہور،۱۹۹۸، ص۹۱،۹۲

۱۳۔ ارشد معراج،ڈاکٹر، جاگیر دارانہ نظام، جدید صنعتی معاشرہ اور اُردو افسانے میں آزادی اظہار کے مسائل، مشمولہ: تحقیقاتِ اُردو جنرل، جلد ا، شمارہ ا جنوری -جون ۲۰۱۱ء، ادارہ تحقیقات اُردو، راولپنڈی، ص۱۹۲

۱۴۔ محمد حمید شاہد،اردو افسانہ صورت و معنی،اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، س۔ن، ص۱۸۷